چھینٹوں سے شرابور ہوتا ہے۔ اس کے ڈوبنے کی کیفیت کو کوئی نہیں جانتا۔ اس کے جذبے سے بہت کم لوگ واقف ہیں۔ اس نے اپنی زبان سے اس کشمکش کا بھی تذکرہ نہیں کیا جو آرا سا اس کے دل میں چلتا ہے، اس کا اظہار کون کرے۔ خود تو ازلی گونگا ہے۔

اگر آپ اس کی شخصیت کی اس بنیادی حقیقت سے واقف ہونا چاہتے ہیں تو اس وقت اسے دیکھئے جب اکیلے میں بیٹھا ہو۔ جب اسے یہ احساس نہ ہو کہ کوئی اسے دیکھ رہا ہے یا اسے دیکھے جانے کے امکانات موجود ہیں۔ اسے ذرا بھی شک پڑ گیا تو اس کے اندر کی طوائف ہشیار ہو جائے گی۔

اشفاق احمد میں ایک بڑی حساس اور دلوں کو مسخر کرنے کی شوقین طوائف موجود ہے جو صرف اس لیے حسن اور رنگینی سے شرابور ہو کر قابل تماشا بن جاتی ہے جب اس میں یہ احساس جاگتا ہے کہ اسے دیکھا جا رہا ہے۔ احساس کے بغیر وہ ایک لاش ہے، ایک خدا ایک لا۔ اس لحاظ سے اشفاق احمد ایک تماش بین عورت ہے۔

اکیلے میں اس کے چہرے کے خطوط نیچے کی طرف ڈھلک جاتے ہیں۔ پیشانی کی سلوٹیں رینگ رینگ کر See-Saw کا پتہ دیتی ہیں جو اس کے دل میں رواں دواں ہے۔ اس کا دل دھک دھک کرتا ہے۔ چپ دکھ، چپ گھڑی چلتی ہے۔ آنکھیں اندھے کنوئیں بن کر دل کی گہرائیوں میں ڈوب جاتی ہیں اور ایک عظیم اکتاہٹ اسے ہر طرف سے گھیر لیتی ہے۔

یہ دکھ اور چپ اس میں کب پیدا ہوئے، کیوں پیدا ہوئے۔ مجھے اس کا علم نہیں لیکن مجھے اس کا علم ہے کہ اس کے بچپن، جوانی اور ادھیڑ عمر میں کوئی ایسا دریچہ نہیں کھلتا جس سے دکھ یا چپ اندر داخل ہو سکتے۔ اس کی زندگی میں دکھ اور چپ کا کوئی جواز موجود نہیں۔

وہ کھاتے پیتے گھر میں پیدا ہوا۔ بہت سے بھائی بہنوں کا ایک کنبہ تھا سب سے چھوٹا بھائی ہونے کی وجہ سے پرابلم بچہ بننے کے امکانات سے صاف بچ گیا۔ سب سے چھوٹے بھائی سے کئی سال بڑا ہونے کی وجہ سے وہ لاشریک محبت کے مزے لوٹتا رہا جس میں ماں باپ کے علاوہ بڑے بھائی بہن بھی شامل تھے۔

اشفاق کی شخصیت میں دکھ اور چپ کا وجود میرے لئے ایک معجزے کی حیثیت رکھتا ہے۔ چونکہ میں نے زندگی میں آج تک اشفاق سا کامیاب آدمی نہیں دیکھا۔ اس نے جوانی میں روایت توڑ محبت کی۔ روایت کی دیواریں اس کے ارد گرد حلقہ کرنے کے لیے کھڑی ہو گئیں۔ اس کے باوجود وہ محبت میں کامیاب ہو گیا۔

احتجاجاً وہ گھر چھوڑ کر باہر نکل گیا۔ بے سہارا بے وسیلہ بے مددگار اور ایک ناممکن العمل کاروبار یعنی سکرپٹ رائٹنگ (Script Writing) کی مدد سے گھر کا چولہا جلائے رکھا۔ اس نے اپنے ذوق کو اپنا ذریعہ معاش بنایا اور نہ صرف کامیابی ہی نہیں بلکہ شہرت حاصل کی۔

بے شک اشفاق نے جدوجہد کی، محنت و مشقت کی لیکن آپ جانتے ہیں کہ جدوجہد اور محنت و مشقت کامیابی کے ضامن نہیں ہوتے۔ جہاں تک اشفاق کا تعلق ہے کامیابی اس کے پیچھے پیچھے یوں چلتی ہے جیسے پالتو کتیا ہو۔ اس سے مجھے شک پڑتا ہے۔ مجھے گمان ہے کہ اشفاق کے کندھے پر کوئی ہاتھ ہے اور اشفاق کی زندگی اس ہاتھوں میں ہے

ہے۔ اشفاق Para-Psychology کو صرف اس لیے نہیں مانتا کہ وہ اس ہاتھ کے وجود کو تسلیم کرنے پر مجبور نہ

ئے۔

میں سمجھتا ہوں کہ اشفاق کی شخصیت کی بیشتر کمزوریاں اسی کامیابی کی وجہ سے ہیں۔ اس لیے ہیں کہ وہ ناکامی

نہیں۔ وہ جدوجہد سے ناواقف ہے۔ کون نہیں جانتا کہ اگر کامیابی ہم رکاب ہو جائے تو جدوجہد نہیں رہتی۔ اگر

ندگی میں دکھ اور چپ نہ ہوتے، بے وجہ دکھ اور چپ، بے نام دکھ اور چپ۔ اللہ واسطے کے دکھ اور چپ تو اشفاق

یاب طوائف بن کر رہ جاتا جو آنکھیں مٹکاتی ہے۔ دنوں کو لبھاتی ہے۔ نگاہیں خیرہ کر کے دولت کے ڈھیر لگا لیتی

دل کی دھڑکنیں نہ محسوس کرتی ہے نہ پیدا کر سکتی ہے۔

ظاہر ہے کہ دکھ اور چپ اشفاق کے لیے قدرت کا ایک عطیہ ہیں جن کی وجہ سے کامیابی کے باوجود اشفاق آج

فنکار ہے۔

1947ء میں جب میں اسے پہلی مرتبہ ملا تو بنیادی طور پر وہ یہی کچھ تھا جو آج ہے۔ دکھ اور چپ کے تار و پود

ٹاٹ کا ٹکڑا جس پر یہاں وہاں سنہرے تاگے سے کڑھی ہوئی پھل پتیاں تھیں۔ آج بھی وہی ٹاٹ کا ٹکڑا ہے۔

کا ٹاٹ پن کچھ اور بڑھ گیا ہے اور سنہری پھول پتیوں میں طوائف کی چمکیلی پسواج کچھ اور نمایاں ہو گئی ہے۔ ٹاٹ

کا تضاد کچھ اور واضح ہو گیا ہے۔

ان دنوں میں مہاجر کیمپ میں مہاجروں کا حوصلہ بندھانے کے لیے مقرر کی حیثیت سے نوکر تھا۔ یہ اور بات

حوصلہ بندھانے کی بجائے میرا اپنا دل ڈوب ڈوب جاتا۔ ایک روز کیمپ کے ایک ویران کونے میں جب میں

دبتے ہوئے دم کو سنبھالنے کی کوشش کر رہا تھا تو ایک چٹی سفید، شگفتگی اور تازگی سے بھرپور کشمیرن میرے روبرو

کھڑی ہوئی۔

آنکھیں چمکا کر بولی۔ ”آپ ممتاز مفتی ہیں؟“

میں نے کہا۔ ”جی۔“

کہنے لگی۔ ”ہم نے آپ کی ”آپا“ پڑھی ہے۔“

میں نے کہا۔ ”جی بہت اچھا کیا آپ نے۔“

بولی۔ ”میں ساتھ والے کیمپ میں ملازم ہوں، کبھی آیئے اُدھر۔“

میں نے کہا۔ ”جی اچھا۔“

بولی ”میرا نام اشفاق احمد ہے۔“

اسے پہلی مرتبہ دیکھ کر مجھے ایسے لگا جیسے سرخ کمخواب پر سنہرے بیل بوٹے کڑھے ہوں۔ شاید آج بھی ان

کی نظر میں جو اسے سرسری طور پر جانتے ہیں، اشفاق احمد سرخ کمخواب پر سنہری پھل بوٹے ہی ہو۔ جیسے وہ پہلی نظر میں

دکھائی دیا تھا۔

پھر اشفاق اور میں ملنے لگے۔

جوں جوں وہ مجھ سے قریب ہوتا گیا۔ توں توں کمخواب جوگیا ٹاٹ میں بدلتا گیا لیکن سنہری پھل چیوں میں کوئی کمی واقع نہ ہوئی۔

پھر جلد ہی مجھے اشفاق کے بھید کا پتہ چل گیا۔ اس ایک جسم میں دو شخصیتیں چھپی ہوئی تھیں۔ جوگیا ٹاٹ احمد تھا۔ سنہرے پھول بوٹے داستان گو تھا۔ مجھے اشفاق احمد سے محبت ہوگئی اور میں داستان گو سے کھلنے لگا۔ اس لیے کہ داستان گو میں سے طوائف جھانک رہی تھی بلکہ اس لیے کہ وہ طوائف میری طوائف سے کہیں زیادہ بھڑ کیلی تھی نفی کر دیتی تھی۔

آپ سے کہہ دوں تو کیا حرج ہے کہ میری دانست میں ہر فنکار میں ایک طوائف ہوتی ہے۔ کسی میں کم کسی میں ادھ گھُٹی کسی میں نمایاں کسی میں ننگی مثلاً ابوالاثر حفیظ میں بالکل ننگی ہے اور طفیل میں بالکل مستور ہے۔ شہاب میں کبھار لب بام آتی ہے اور اشفاق میں گھونگھٹ نکال کر سامنے بیٹھی رہتی ہے۔ بہرحال آج بھی اشفاق احمد میرا دوست ہے لیکن داستان گو سے مجھے چڑ ہے۔

ان دنوں اشفاق اور میں روزانہ اوپن ایئر تھیٹر میں ملا کرتے تھے۔ اوپن ایئر تھیٹر ان دنوں زوبی کے تھا۔ زوبی ایک اُبھرتا ہوا آرٹسٹ تھا، سنا ہے آج کل وہ کراچی کا رئیس ہے۔

زوبی ایک خوش پوش نوجوان تھا۔ کم گو تھا لیکن بات میں پھلجھڑی تھی۔ ذہین تھا لیکن خدوخال ایسے منظر عام پر نہیں آتی تھی۔ رنگین تھا لیکن چہرے پر بے نیازی کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ اتنے ڈھیر کہ چہرہ کی سب سے بڑی خصوصیت ایک پُراسرار خصوصیت تھی جو غور و خوض کے باوجود میری سمجھ میں نہیں آتی تھی اور ایک مستقل چیلنج بنی ہوئی تھی۔

زوبی کی درمیانہ سی شکل و صورت، عام سی چال ڈھال اور عام سی بات چیت کے باوجود لڑکیاں بیگمات سپردگی کے منفرد اور واحد جذبے سے سرشار، دور دور سے اپنے خرچ پر اوپن ایئر تھیٹر میں آتیں اور بن ملاقات کے بغیر دیوتا کی بھینٹ چڑھ کر خوشی خوشی واپس چلی جاتیں اور دیوتا مہاراج یوں نروان زدہ بیٹھے رہتے جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔ جیسے بھینٹ لینا ان کا پیدائشی حق ہو۔

اشفاق کے لیے یہ سب لا تُمّ شاٹ تھے۔ داستان گو کے لیے صرف رنگین تفصیلات تھیں جو وہ اپنے اندر بھرتا رہتا تھا۔ اشفاق اور داستان گو دونوں کو جنس سے کوئی دلچسپی نہ تھی اور میں جو اپنے کو جنسیات کا طالب علم کتابی مسائل میں بڑی دسترس رکھتا تھا، میرے لیے اوپن ایئر تھیٹر میں ہر نئی بھینٹ کی آمد ایک تھپیڑ کی حیثیت رکھتی چونکہ مجھے سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ سب کس اصول کے تحت ہو رہا ہے، اس عمل میں سبب کیا ہے، نتیجہ کیا ہے۔

چٹاخ...... میرے علمی زعم کے منہ پر تھپیڑ پڑتا۔ داستان گو میری بے بسی پر بغلیں بجاتا۔ چٹاخ پڑتا۔ اشفاق میرے قریب آ بیٹھتا اور اپنا جوگیا ٹاٹ میرے گرد لپیٹ دیتا جیسے حقائق کی دیدہ دلیری کے خلاف رہا ہو۔ دیدہ دلیر دیوتا حیرت سے ہماری طرف دیکھتا جیسے اس کی سمجھ میں نہ آ رہا ہو کہ بات کیا ہے۔

پھر ماحول کی گھٹن دور کرنے کے لیے داستان گو میدانِ عمل میں آ جاتا اور سنہری باتوں کے غبارے

…ے جاذب توجہ کلوز اَپ۔ دل نشین تفصیلات، نقلیں، Mimics، قصے، کہانیاں، لوک کتھائیں حتیٰ کہ اوپن ایئر تھیٹر …بن جاتا جس میں قہقہے گونجتے، تالیں بجتیں اور دیوتا بھینٹ کا قصہ پس پشت پڑ جاتا۔

ان دنوں اشفاق احمد ایک لق و دق جزیرے میں رہتا تھا، جو رابنسن کروسو کے جزیرے سے کہیں زیادہ ویران …ق احمد کا یہ جزیرہ ایک وسیع و عریض رستے بستے گھر کی دوسری منزل پر واقع تھا۔ نچلی منزل میں میلہ لگا رہتا۔ …ے چلتے، ہنڈول جھولتے۔ شور شرابا گونجتا۔ اوپر منزل میں ہو حق اور عظیم خلا کے تلے دبا ہوا سہا ہوا اشفاق احمد۔

اشفاق احمد کی کشادہ نیم چھتی میں چاروں طرف کتابوں کے انبار لگے ہوئے تھے۔ پتہ نہیں کہ کتابوں کے انبار …یکھنے سے دل میں ایک بے نام عجز کیوں پیدا ہو جاتا ہے۔ اسی وجہ سے نیم چھتی میں اکیلا اشفاق بیٹھا رہتا تھا۔ …وہاں دم گھٹتا تھا، لہٰذا اس نے وہاں کبھی قدم نہ رکھا تھا۔

اس جزیرے میں آنے جانے کے بعد میں نے جانا کہ اشفاق صرف چپ اور دکھی ہی نہیں بلکہ وہ ازلی اکیلا …لی تنہا۔ وہ بذات خود ایک جزیرہ ہے جو کسی کشتی کو کنارے لگنے نہیں دیتا۔ جو نہیں چاہتا کہ کوئی اس کی وحدت

سارا سارا دن وہ کتابوں کے انباروں تلے ڈھیروں جوگیا ٹاٹوں میں لپٹا ہوا پڑا رہتا۔ پتہ نہیں اس بوجھل تنہائی …یا ٹاٹ کے ڈھیر کی وجہ سے یا جوگیا رنگ کی وجہ سے، اس میں ایک عظیم اکتاہٹ بیدار ہو جاتی۔ ایک وحشت سی …۔ پھر وہ سنہرے پھول بوٹوں والا چغہ پہن لیتا۔ چغہ پہنتے ہی طوائف جاگتی، چہرے کے زاویے اوپر کو ابھر …تی پر رو غنی تبسم آ جاتا اور وہ نیم چھتی کی سیڑھیاں اتر کر چٹکیاں بجاتا ہوا لاہور کی بھیڑ میں جا داخل ہوتا۔

اوپن ایئر تھیٹر یا کسی اور مقام پر جا پہنچتا۔ ڈگڈگی بجاتا، گھنگھرو چھنکاتا، مجمع لگاتا۔ تھیلے سے رنگین داستانیں …نکالتا، آنکھیں چمکاتا، قہقہے لگاتا۔ خود ناچتا مجمع کو نچواتا۔ … لیکن داستان گو کا یہ ورزا دورانیہ مختصر چلتا تھا۔ اس …ویران جزیرہ، وہی ہو حق، وہی جوگیا ٹاٹ، وہی دکھ، وہی چپ، وہی تنہائی۔

اشفاق کی یہ دو شخصیتی زندگی سٹیونسن کے ڈاکٹر جیکل اور مسٹر ہائیڈ کی طرح نہیں تھی۔ چونکہ اشفاق کی شخصیت …ئیڈ کا عنصر سرے سے مفقود ہے۔ داستان گو طوائف کا شر صرف مجمع لگانے اور اپنے سنہرے پھول بوٹوں کی …نے تک محدود ہے۔ یہ فن برائے فن شغل کسی مطلب یا مقصد سے بے نیاز ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ اپنی اس تصنیف میں سٹیونسن نے خیر اور شر کا سہارا لے کر انسانی شخصیت کے گوناگوں تضاد …ے جان چھڑانے کا اہتمام کیا ہے۔

اشفاق احمد میں چھپے ہوئے دونوں افراد ڈاکٹر جیکل تھے۔ ایک مٹی کی ہنڈیا کے مصداق تھا جس میں دکھ، چپ …کے کیچوے رینگ رہے تھے۔ دوسرا نقش و نگار سے سجا ہوا چاندی کا سرپوش تھا جو ہنڈیا اور کیچوؤں کو چھپانے کے …ے ڈیکوریشن پیس کی حیثیت رکھتا تھا۔

اس زمانے میں اشفاق کی زندگی اس عورت کی طرح گزر رہی تھی جو سارا دن ننگے سر ننگے پیر اَن دھلا منہ اور بن …ے دھوپ میں بیٹھی "ہونسیاں پانے" میں مصروف رہتی ہے اور شام کو سنگار کر کے پسواج پہن کے طوائف بن

جاتی ہے۔فرق صرف یہ تھا کہ یہ طوائف لینے دینے اور بکنے بکانے سے بے نیاز تھی۔

پتہ نہیں فنکار کی تخلیق میں قدرت کا تضاد کا آرا کیوں چلاتی ہے۔ بنیادی طور پر اپاہج بنا کر پھر اسے انگیخت کیوں دیتی ہے۔ازلی طور پر گونگا بنا کر پھر اسے باتوں کی پھلجھڑیاں چلانے پر کیوں اکساتی ہے۔ کسی نہ کسی کر پھر دکھ کے بادلوں کو ٹکرا کر بجلی کے قمقمے کیوں جلاتی ہے۔ پتہ نہیں قدرت ایسا کیوں کرتی ہے مگر وہ یقیناً ایسا کرتی اس زمانے میں اس ویران جزیرے میں تنہائی، دکھ اور چپ کے بنیادی رنگوں سے قدرت ایک فنکار رہی تھی۔

اشفاق احمد درحقیقت اشفاق احمد خاں ہے، وہ ذات کا پٹھان ہے لیکن اس کی شخصیت میں پٹھان کی نہیں۔ ممکن ہے اس کی وجہ تبدیلی آب وہوا ہو۔اس کی تنہائی کی ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ وہ اس رستے چاروں طرف سے یوں پٹھانوں میں گھرا ہوا تھا جیسے کوئی شودر برہمنوں میں گھرا ہوا ہو۔

اپنی مٹی میں پٹھان چند ایک واضح اور نمایاں خصوصیات کا حامل ہوتا ہے جو پٹھانیت کی شاہد ہوتی ہے آب وہوا بدل دیئے جائیں تو پٹھان میں نئے جوہر پیدا ہوتے ہیں۔ نئی صلاحیتیں بیدار ہوتی ہیں۔ تخلیقی ولولے ہیں جو پٹھانیت کی دیگر مثبت خصوصیات کو دبا دیتے ہیں۔ غالباً اسی وجہ سے پٹھان ان پٹھانوں کو نہیں مانتے جو تبدیل ہوا کے مرتکب ہوتے ہیں اور انہیں اپنانے سے گریز کرتے ہیں۔

اشفاق احمد وہ پٹھان ہے جسے پٹھان پٹھان نہیں مانتے اور وہ خود بھی اپنی طبعی ناپٹھانیت کو تسلیم کرتے تبدیلی آب وہوا کی وجہ سے یا جانے کیوں اشفاق احمد میں کئی ایک ہفت رنگی عناصر پیدا ہو چکے تھے شخصیت میں ایک بھیڑ لگی ہوئی ہے۔ ایک جٹا دھاری سادھو رکھ رکھاؤ سے سرشار ایک صوفی خود نمائی سے طوائف، پتھر کا بنا ہوا ایک دیوتا۔ دوسروں کو نصیحتیں کرنے پر پھبتیاں کسنے والا تلقین شاہ، سن کر جذب کر لینے کان۔ ایک صف میں کھڑا ہونے والا محمود، چھوت چھات کا متوالا کشمیری پنڈت۔ مشینوں سے کھیلنے والا ایک پُرزوں کو ذی روح جاننے والا ایک بدھ پجاری۔ مدہم محبت سے سرشار مگر نہ دھڑکنے والا ایک دل پیسے پیسے والا ایک بنیا، لٹیا لنڈھانے والا ایک غنی۔ دے کر کبھی نہ بھولنے والی ایک معمر عورت اور نہ جانے کیا کیا صلاحیت نہیں کہ ایک رنگا رنگ ہفت رُخی شخصیت کا احاطہ کر سکوں۔

دورِ حاضر کے جانے پہچانے شخصیت نگار محمد طفیل کی طرح میں الفاظ میں شخصیت کی تعمیر نہیں کر تجزیے کی قینچی سے کاٹ پیٹ کر کے شخصیت کے بنیادی عناصر کی نشاندہی کر سکتا ہوں۔ محمد طفیل انسانی شخصیت کے (Jig Saw) ٹکڑوں کو بڑی محبت بڑے صبر وتحمل سے جوڑتا ہے۔ مجھ میں محمد طفیل سا صبر نہیں، تحمل نہیں۔ مشاق رنگین بیانی نہیں۔

سمجھ میں نہیں آتا کہ محمد طفیل نے آج تک اشفاق احمد کی شخصیت پیش کرنے سے بخل کیوں فرمایا ہے منہ بند ھا حاضر ور ہے لیکن وہ بخیل نہیں۔ شاید اس کی وجہ اشفاق خود ہو جو کسی کشتی کو اپنے کنارے لگنے نہیں دیتا۔ یہ وجہ سنہرے پسواج والی طوائف ہو جو چاروں طرف گھوم پھر کر اشفاق احمد کے خلاف پروپیگنڈہ کرتی پھرتی ہے

بات یقینی ہے کہ مولانا محمد طفیل کا اسلام ابھی خطرے کی حدود سے باہر نہیں نکلا، اس لیے وہ ابھی گھنگھرو کی آواز کے متحمل نہیں ہو پائے جبھی تو وہ اپنی طوائف کو سات پردوں میں ملفوف رکھتے ہیں۔

اشفاق احمد کے والد ایک عظیم شخصیت تھے۔ اتنی عظیم کہ انہوں نے خان منزل کے تمام افراد کو کبڑا بنا رکھا تھا۔ اس وجہ سے گھر میں بالشتیوں کی بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ جب یہ گلیور گھر پر ہوتا تو کسی کو دم مارنے کی اجازت نہ ہوتی۔ جب وہ گھر سے باہر ہوتا تو گھر میں دھما چوکڑی مچ جاتی لیکن ان کی بیگم اس سوچ میں کھوئی رہتیں کہ عجز و ادب اور احترام کا کون سا طریقہ ایجاد کیا جائے جس کی مدد سے ظل الٰہی کو ڈھب پر لایا جا سکے۔

خان منزل میں صرف پٹھان خصوصیات کی قدر و منزلت تھی۔ چونکہ اشفاق ان خصوصیات سے محروم تھا، لہٰذا اس گھر میں وہ سب سے چھوٹا بالشتیا تھا۔ چونکہ ازلی گونگا تھا اس لیے متکلم احتجاج نہیں کر سکتا تھا۔ یوں اشفاق احمد کی دبی تہوں میں احتجاج کا ایک طوفان اکٹھا ہوتا رہا۔ اسی عرصہ دراز سے دبے ہوئے طوفان کی وجہ سے اشفاق احمد آج بھی کسی گلیور کی عظمت تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں۔ وہ کسی لحاظ سے کسی پہلو سے اپنے کو بالشتیا سمجھنے یا ماننے پر آمادہ نہیں ہو سکتا۔ اگرچہ فنکارانہ عظمت کا خود تذکرہ نہیں کرے گا لیکن اس کا جی چاہے گا دوسرا کرے۔ دوسرا کرے تو اشفاق احمد کے چہرے پر پھلجھڑیاں چلنی شروع ہو جائیں گی۔ چہرے کے زاویے اوپر کو ابھریں گے۔ آنکھوں میں ترکی مکان کی چمک ظاہر ہوگی۔ اگر دوسرے فنکار کی عظمت کی بات چھڑ جائے تو وہ اسے کاٹے گا نہیں لیکن آپ کی ہاں میں ہاں بھی نہیں ملائے گا۔ اشفاق احمد کی شخصیت کے بنیادی سادھوپن سے مجھے انکار نہیں لیکن اس کی فنکارانہ انا خاموشی کے گھونگھٹ میں چھپے رہنے کے باوجود کچھ زیادہ ہی طوطا چشم ہے۔ ہاں وہ فنکارانہ عجز سے کورا ہے۔

اس جزیرے کی بوجھل تنہائی میں اشفاق احمد نے جو اظہار کا پہلا طریقہ آزمایا، وہ مصوری تھا۔ اس کا مصوری کی طرف مائل ہونا غالباً زوبی سے میل ملاپ کی وجہ سے تھا۔

ویسے تو میں نے اشفاق کے بنائے ہوئے کئی ایک مکمل اور ادھورے عمل دیکھے تھے لیکن دو عمل مجھے خصوصی طور پر یاد ہیں شاید اس لیے کہ وہ دونوں میرے مضمون یعنی جنس سے متعلق تھے۔

اشفاق کے پہلے عمل کا نام دی کال بل (The Call Bell) تھا۔ تصویر میں نسائی جسم کا وہ برقی بٹن دکھایا گیا تھا جو بڑے سے محترمہ احترام کے پردے چاک کرکے باہر نکل آتی ہے۔ تصویر کو دیکھ کر ایسے لگتا تھا جیسے باہر آنے والی حقیقت ایک جن ہو جسے نسائی بوتل میں قید کر رکھا ہو۔ عمل کی عظمت یہ تھی کہ تصویر میں ایک نظر میں محترمہ دکھائی دیتی اور دوسری نظر میں جن۔

دوسری تصویر کا کوئی نام نہ تھا۔ ہوتا تو The Phallic Woman ہوتا۔ یہ تصویر بھی عورت ہی کی تھی جو اپنے جنسی کی مثلی علانیہ منظر عام پر کندھوں پر اٹھائے پھرتی تھی اور صرف اٹھائے ہی نہیں پھرتی تھی بلکہ اسے چھلکاتی تھی۔ تصویر کی خوبی یہ تھی کہ ایک نگاہ میں وہ ننگی نظر آتی تھی اور دوسری نگاہ میں معصومیت میں ملفوف جیسے جانتے نہیں۔

پتہ نہیں اشفاق احمد نے جنس کے موضوع کو عمل نگاری میں کیوں اپنایا اور اگر اپنایا تھا تو اسے کیوں چھوڑ دیا۔ ایک بات قطعی طور پر یقینی ہے کہ اشفاق احمد اور داستان گو دونوں کو جنس سے کوئی لگاؤ نہیں۔ دونوں کو جنس صرف اسی صورت میں

گوارا ہے جب وہ جذبے کے سینڈوچ میں چھپا ہوا ہو۔

میری دانست میں جنس کے اس لحاظ سے مردوں کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک وہ جو جنس دریچہ کھولنے کے بغیر جنس کے ایوان میں چہل قدمی کے شوقین ہیں۔ دوسرے وہ جن میں جنس کی وجہ سے جذبے کھل جاتا ہے اور تیسرے وہ جن میں جذبے کی وجہ سے جنس کی کھڑکی نیم وا ہو جاتی ہے۔ اشفاق احمد ازلی طور پر تیسرے سے تعلق رکھتا ہے۔

ان دنوں اشفاق احمد کی آرزو تھی کہ حسین اور طرح دار لڑکیوں کو باتوں کے جال بُن کر اپنی طرف متوجہ کرے کہ وہ اثر سے بھیگ جائیں۔ متوجہ اور متاثر کر لیتا تو پھر گھبراہٹ اور خوف طاری ہو جاتے۔ ''اب کیا ہوگا'' ہوگا'' کے متعلق اس کا ذہن بے خبر نہ تھا لیکن دل تیار نہ تھا، لہٰذا ''اب کیا ہوگا'' کے خوف سے وہ بھاگ لیتا۔ الٹے بھاگ لیتا۔

دراصل اشفاق کی خواہش یہ تھی کہ لڑکی اس کی داستانوں کے جال میں پھنسے۔ اثر سے بھیگ جائے۔ اثر بھیگ جائے کہ اس میں حرکت کی طاقت نہ رہے۔ دور کھڑی رہ کر بات کرے۔ محفوظ فاصلہ قائم رکھے تاکہ ''اب کیا'' خطرہ پیدا نہ ہو۔

لیکن آپ جانتے ہیں کہ نسائی نفسیت کے مطابق فاصلے محفوظ نہیں ہوتے قرب محفوظ ہوتا ہے، لہٰذا حفاظت کے لیے آگے بڑھنے پر مجبور ہوتی ہیں۔ اس کے برعکس اشفاق احمد کے لیے پیچھے ہٹنا محفوظ تھا، لہٰذا بار بار ہٹنا۔ الٹے پاؤں بھاگا، ہونکتا ہوا اپنے جزیرے میں پہنچا۔ بارہا اس نے خطرے کے مقام پر باتوں کے جال بُنے لیکن باتوں کے جال بننے کی عادت اس کی ہڈیوں میں رچی ہوئی تھی، لہٰذا بارہا تو یہ ہوئی۔ بارہا وہ الٹے پاؤں بھاگا ہونکتا ہوا اپنے جزیرے میں پہنچا۔ جب گورنمنٹ کالج کے میدان میں وہ محترمہ منظر خاص پر آ گئی۔

وہ محترمہ بڑی چترکار تھی۔ اس کی آنکھ میں دو دھاری نگاہ تھی۔ اندر سے قدیم تھی، اوپر سے جدید اوڑھ رکھا تھا۔ اندر پرانا مشرقی رنگ تھا اوپر ڈسٹمپر تھا یعنی دروپدی کے سونے پر گیشیا کا ملمع چڑھا ہوا تھا۔ وہ متاثر کرنے کی بجائے متاثر کی چترکاری سے واقف تھی اور متاثر ہو کر آگے بڑھنے کی بجائے پیچھے ہٹنے کی عظمت تھی۔ وہ محترمہ ان مشرقی خواتین میں سے جو پیچھے ہٹنے والے کو پہچان لیتی ہیں اور خود پیچھے ہٹ کر اسے پیچھے ہٹے..... اشفاق احمد کے لیے یہ ایک نیا تجربہ تھا، وہ اسے پیچھے ہٹتے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ اب کیا ہوگا کے خوف سے ندامت سے بچا لیتی ہیں۔

وہ محترمہ اشفاق احمد کی باتوں کے جال میں پھنس گئی۔ تاثر سے بھیگ گئی اور پھر آگے بڑھنے کی بجائے ہو کر پیچھے ہٹنے کی بجائے آگے بڑھنے لگا اور آگے۔ اشفاق کے لیے یہ ایک نیا اور انجانا مشاہدہ تھا جس میں آگے لذت موجود تھی لیکن فاصلہ کم ہونے کا ڈر نہ تھا۔ آگے بڑھتے بڑھتے وہ اس مقام پر جا پہنچا جہاں سے واپسی ممکن نہیں

اشفاق احمد نے برش اور رنگ کو کیوں الماری میں بند کر دیا اور ان کی جگہ قلم کو کیوں اپنایا۔ مجھے اس کا حالانکہ عمل معانی اور تکنیک کے لحاظ سے کامیاب تھے۔ اصولی طور پر تو اشفاق کو موسیقار ہونا چاہیے تھا کیونکہ اس کے

یقار نہ بننے کی وجہ شاید یہ ہو کہ اسے انسانی کردار کے گونا گوں روپ سے بے پناہ دلچسپی ہے۔ اس لیے خالی آواز زیرو سے نہ کر سکا۔

قلم اٹھاتے ہی تفصیلات نے اسے چاروں طرف سے آ گھیرا۔ وہ تفصیلات جن کے بل بوتے پر داستان گو مجمع تا داستان گو نے اپنے تھیلے سے کلوز اپ کے رول کے رول نکال کر باہر رکھ دیئے۔ اشفاق احمد نے ان بھڑکیلی یدات کو ایسے میں چھان لیا۔ بے نام دکھ اور چپ کی چاشنی کی وجہ سے ان میں ادبی رنگ پیدا ہو گیا اور اشفاق احمد افسانہ بن گیا۔ اگرچہ اس کا سہرا اس گونگے اکیلے دکھ کے پٹارے اشفاق احمد کے سر پر تھا لیکن تفصیلات تو داستان گو کی تھیں، ن گو نے لپک کر اپنے سر پر لگا لیا۔

اس زمانے میں اشفاق احمد کو کچھ کرنے کا شوق تھا، کر دکھانے کا نہیں۔ آج کل اسے کچھ کرنے کا شوق بھی تھا گر کبھی چونکہ وہ شو بزنس میں کامیابی حاصل کر چکا ہے۔ اس کے باوجود بنیادی طور پر وہ ایک مزدور ہے، وہ کدال چلا ہے۔ بیج بو سکتا ہے، فصل اگا سکتا ہے۔ اسے یہ تمنا ہے کہ فصل کو دیکھ کر لوگ واہ واہ کہتے کہ کیسے اچھے بوٹے ہیں لیکن فصل نہیں سکتا۔ وہ اپنے فن کی گڈول (Good Will) پیدا کرنے کا متمنی ہے لیکن اس گڈول کو کیش کرانے کا اہل نہیں۔

ادبی دنیا میں ابھی مقام پیدا ہی نہیں ہوا تھا کہ اشفاق احمد کو دنیاوی مصائب نے آ گھیرا۔ ان مصائب کی تمام تر ایک فرائی ڈے تھی۔ جزیرے کے رابنسن کروسو نے اس فرائی ڈے کو اپنا لیا۔ اس کا یہ فعل اس ویران اور تنہائی زدہ یرے کا ایمان تھا، لہٰذا جزیرے نے اشفاق احمد کو اگل دیا اور وہ دنیاوی مصائب کے طوفان زدہ پانیوں میں ڈبکیاں نے لگا۔

اب رابنسن کروسو اور فرائی ڈے کو کسی چھت تلے سر چھپانا تھا، چولہا جلانے کا اہتمام کرنا تھا۔ دو وقت کی روٹی کرنا تھا، لہٰذا اشفاق احمد سکرپٹ رائٹر بن گیا۔ خوش قسمتی سے یہ فرائی ڈے وہ محترمہ تھی جو پیچھے بننے والے کو آگے بڑھنے دے سکتی تھی جو بہتر نصف کا بوجھ بننے کے بجائے شوہر کا ساتھ دے سکتی تھی، لہٰذا دونوں میاں بیوی نے اپنے اپنے نوں پر ڈانکائے، ہاتھوں میں کاغذ کی سلیپیں تھامیں اور لاہور کے گلی بازار میں پھیری لگانے لگے۔ چلو بھئی کوئی سکرپٹ لو۔ چلو بھئی کوئی سکرپٹ لکھوالو۔

عرصہ دراز تک اشفاق احمد کے گھر میں تمام حساب کتاب سکرپٹوں کا ہوتا رہا۔ کرایہ مکان چار سکرپٹ۔ ی خانے کا خرچ آٹھ سکرپٹ، لین دین ایک سکرپٹ، علاج معالجہ آدھا سکرپٹ۔ آج بھی اشفاق کی بیگم سے پوچھو یہ ساڑھی کتنے میں لی تھی تو وہ جواب دے گی، اچھی طرح سے یاد نہیں شاید ایک سکرپٹ لگا تھا یا ڈیڑھ۔

بانو قدسیہ کی آمد کے بعد اشفاق احمد کے گھر میں دکھ کے ڈھیر لگ گئے۔ یہ دنیاوی دکھ نہ تھے چونکہ اشفاق احمد یابی پر کامیابی حاصل کیے جا رہا تھا۔ یہ دکھ ازدواجی بھی نہیں تھے۔ چونکہ اشفاق کو بانو سے محبت تھی اور بانو صرف اشفاق سے جیتی تھی۔ دکھ کے ان ڈھیروں کی وجہ صرف یہ تھی کہ بانو اشفاق کے دکھ کو بانٹنے پر مصر تھی لیکن یہ نقطہ وضاحت طلب ہے۔ اس سلسلے میں پہلی بات یہ ہے کہ ایک لحاظ سے بانو کا اشفاق سے تعلق کچھ ایسا ہے جیسے حبیب کا تعلق اپنے بڑے بھائی ت اللہ سے ہے۔

میرے دوست قدرت اللہ شہاب جو دکھتے نہیں لیکن دیکھتے ہیں۔ ایک روز مجھ سے کہنے لگے۔ اللہ تعا[illegible] بہت مہربان ہیں۔ میں نے کہا، وہ کیسے؟ بولے انہوں نے میرے تحفظ کا ایک انوکھا انتظام کر رکھا ہے۔ میں نے پو[illegible] کیا؟ بولے میرے حصے کے سارے دکھ میرے چھوٹے بھائی حبیب کو منتقل کر دیے جاتے ہیں اور حبیب کی سار[illegible] مجھے منتقل کر دی جاتی ہیں۔ میں نے کہا، مطلب کیا ہوا؟ کہنے لگا کانٹا مجھ کو چبھتا ہے۔ درد حبیب کو ہوتا ہے۔ قہقہہ حبیب [illegible] ہے، خوشی مجھے منتقل ہو جاتی ہے۔ اس کی صرف باچھیں دُکھنے لگتی ہیں۔ میں نے کہا سچ، کیا ایسا ہو سکتا ہے؟ بولے [illegible] ہے۔ ہو رہا ہے۔ میں نے کہا، میں نہیں مانتا۔

کچھ عرصہ بعد قدرت اللہ شہاب کی آسامی کے متعلق راولپنڈی میں شدید گڑبڑ ہو گئی۔ حبیب کرا[illegible] اسے اس گڑبڑ کا علم نہ تھا۔ شام کو حبیب کا فون آیا۔ کہنے لگا وہاں کوئی گڑبڑ تو نہیں۔ میں نے کہا بالکل نہیں۔ بولا مي[illegible] ہے کہ ہے۔ میں نے کہا، تیرا دل تو دیوانہ ہے۔ بولا وہ تو ہے لیکن بکار خویش ہشیار ہے۔ میں نے کہا فضول باتیں [illegible] پنڈی آ جاؤں؟ میں نے کہا، ضرورت بھی ہو۔ بولا تمہیں یقین ہے کوئی گڑبڑ نہیں۔ میں نے کہا بالکل۔ اگر میر[illegible] یقین نہ ہو تو شہاب سے پوچھ لو۔ شہاب نے فون پر آ کر کہا، یہاں بالکل خیریت ہے۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں [illegible] سے سو جاؤ۔

اگلے روز صبح سویرے حبیب نائٹ کوچ سے پنڈی آ پہنچا۔ کہنے لگا تمہاری تسلیوں کے باوجود مجھے چین [illegible] تھا۔ دل کہتا تھا ضرور یہاں گڑبڑ ہے اور قدرت تکلیف میں ہے۔ اس لیے میں کرایہ ادھار لے کر چلا آیا۔

اس روز مجھے پتہ چلا کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ کانٹا کسی کو چبھے اور درد کسی اور کو ہو۔

اگر کانٹا اشفاق کو صرف چبھتا اور دکھ صرف بانو کو ہوتا، اشفاق کو نہیں یا دکھ اشفاق کو ہوتا اور بانو اسے [illegible] اک بات ہوتی لیکن اشفاق کا دکھ کانٹوں سے بے نیاز ہے۔ اسے اس بات پر دکھ ہے کہ اسے کوئی دکھ نہیں۔ اس [illegible] وجہ ہے۔ بے مقصد ہے، ازلی ہے، ازلی دکھ کو کوئی بانٹ نہیں سکتا۔ وہ ایک کنوئیں کی طرح ہے۔ بانو چاہے ڈول [illegible] نکالتی چلی جائے کنواں جوں کا توں بھرا کا بھرا رہے گا۔ بانو اپنی طبیعت سے مجبور ہے۔ دکھ بانٹنے کے لیے وہ ڈو[illegible] نکالتی رہتی ہے۔ اشفاق اپنی اصلیت کی وجہ سے مجبور ہے۔ اس کا کنواں بھرا کا بھرا رہتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ گھر میں [illegible] بے مقصد بے معنی دکھ کے انبار لگے ہوئے ہیں۔ آپ جانتے ہی ہیں کہ بے معنی ہو تو دکھ کی دھار اور بھی تیز ہو جاتی [illegible]

کئی ایک برس اشفاق اور بانو دن کے وقت لاہور کے بازاروں میں سکرپٹ لکھوالو کی پھیری لگاتے [illegible] رات کو قلم کے پھاؤڑے چلاتے رہے۔ آج وہ پھیری نہیں لگاتے لیکن قلم کا پھاؤڑا پہلے کی نسبت کہیں زیادہ چلاتے [illegible] حیرت کی بات ہے کہ ان کے گھر چلے جاؤ تو یہ احساس نہیں ہوتا کہ یہ منشیوں کا گھر ہے۔ وہ تو فارغ البال میزبانوں کا گھر [illegible] ہے۔ یہ آج کی بات نہیں اس زمانے میں بھی وہ فارغ البال میزبانوں کا گھر لگتا تھا جب چولہا جلائے رکھنے کا [illegible] پیش تھا۔ دوسری حیران کن بات یہ ہے کہ اشفاق اور بانو دونوں کے سکرپٹوں سے کبھی مشقت کے پسینے کی بو نہیں آئی۔

اسی زمانے میں داستان گو کو شرارت سوجھی۔ اس نے اشفاق احمد میں چھپے ہوئے اس ٹھگنے بالشتیے کو تھپ[illegible] جسے اشفاق کے بچپنے میں کسی گلیور نے تخلیق کیا تھا اور جو جذبہ انتقام سے اندر ہی اندر اب تک سلگ رہا تھا۔

دراصل اشفاق کو غصہ نہیں آتا۔ وہ بھڑک کر جلنے کی لذت سے محروم ہے۔ وہ چڑتا ہے، بل کھاتا ہے، سلگتا ہے سلگن کا دوسرے کی ناک میں دھواں دیتا رہتا ہے۔ آپ کوئی بات کہہ دیں تو وہ چپ ہو جائے گا، جواب نہیں دے گا اس کے اندر چڑ چڑ دانے بھنتے رہیں گے۔ کئی بار یہ چڑ اس قدر شدید ہو جاتی ہے کہ اس کا گھر بھٹیارن کی کڑھائی بن کر رہ جاتا ہے۔

ہاں تو داستان گو نے اس ٹھگنے کی چڑ کو جگا دیا۔ اشفاق کے روبرو ایک گلیور آ کھڑا ہوا۔ ایک ایسا گلیور جو دوسروں کو تلقین کرنے کا متوالا تھا۔ اشفاق نے قلم سنبھالا اور دوسروں کو تلقین کرنے والوں کا بھانڈا پھوڑنا شروع کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تلقین شاہ صاحب عالم وجود میں آ گئے۔

تلقین شاہ ایک عظیم کردار ہے، ایک روایتی گلیور۔ لوگوں نے تلقین شاہ کو سنا تو بھونچکے رہ گئے۔ ہر کسی کے دل کی تہوں سے چھپے ہوئے باشتیے نے سر نکالا اور لوگوں کو تلقین کرنے والے اس گلیور پر تالیاں بجانے لگا جس نے اسے خلق کیا تھا۔ ہم سب میں ایک نہ ایک باشتیا موجود ہے جس کا وجود کسی نا کسی تلقین شاہ کا مرہونِ منت ہے۔

تلقین شاہ کی آمد پر بہت سے بھرے ہوئے پھوڑے پھوٹ گئے۔ دلوں میں تنے ہوئے پیچ و تاب ڈھیلے پڑ گئے۔ دبے ہوئے غصے تمسخر کی صورت میں نکلنے لگے۔ انتقام کے جذبات ترس میں بدل گئے۔ پند و نصیحت کا بھانڈا چوراہے پر پھوٹ گیا۔ تلقین شاہ ایک عظیم کردار ہی نہیں۔ وہ ایک سائیکی ایٹرسٹ (Psychiatrist) بھی ہے۔ ایک عظیم ڈاکٹر جس نے کبڑوں کو سیدھا کر دیا۔ باشتیوں کو قد و قامت عطا کیے، گونگوں کو زبان بخشی۔ دلوں میں پڑی ہوئی گرہوں کو کھول دیا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ اپنے بتوں کو توڑ دیا۔

لوگوں نے فرطِ محبت سے اس بت شکن کو آنکھوں پر بٹھا لیا اور اشفاق احمد ہکا بکا رہ گیا۔ اسے پہلی مرتبہ پتہ چلا کہ عوام آنکھوں پر بٹھا لیں تو آسمان کے تارے قدموں میں آ گرتے ہیں۔ اسے پہلی مرتبہ پتہ چلا کہ شہرت کا مفہوم کیا ہے۔

ریڈیو کے پروگرام میں ایک رات تلقین شاہ نے ہدایت اللہ سے کہا کہ وہ کہیں سے مالٹوں کے چھلکے اکٹھے کر کے شاہ صاحب کے مکان کے دروازے پر ڈھیر کر دے تاکہ محلے والے سمجھیں کہ شاہ صاحب کے گھر میں پھل اس کثرت سے کھائے جاتے ہیں تاکہ محلے میں ان کی ساکھ پیدا ہو۔

اگلی صبح اشفاق احمد کے مکان کے صدر دروازے پر مالٹے کے چھلکوں کا ایک بہت بڑا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ پتہ نہیں اشفاق کے شیدائیوں نے رات کے اندھیرے میں مالٹے کے اتنے سارے چھلکے کہاں کہاں سے چن کر اکٹھے کیے تھے۔

اشفاق احمد کے مالک مکان نے جان بوجھ کر واٹر ٹیکس ادا نہ کیا تاکہ نل کٹ جائے اور اشفاق احمد مکان خالی کر دے تاکہ مکان زیادہ کرائے پر لگ سکے۔ نل کاٹنے کے لیے دو لائن مین آ گئے۔ ہم نے انہیں بہت سمجھایا کہ میاں جلد بازی سے کام نہ لو۔ کچھ مہلت دو لیکن وہ نہ مانے۔ جب دلیل سے کام نہ چلا تو ہم نے ان کی منتیں کیں۔ پھر بھی وہ نہ مانے۔ اس اثنا میں اشفاق آ گیا۔ اس نے صورت حالات کا جائزہ لیا اور معاملہ بھانپ لیا۔ پھر وہ لائن مینوں سے تلقین شاہی زبان میں بولا۔ ہاں کاٹ دو۔ اس نل کو فوراً کاٹ دو۔ جو نہ کاٹا گیا تو یہ خدشہ لگا رہے گا کہ کسی روز ہم چلّو بھر پانی میں ڈوب

مریں۔شاہ کی آواز سن کر لائن مینوں کے ہاتھ رک گئے۔ بولے شاہ جی...... آپ؟ تلقین شاہ بولا، ہاں ہاں بھئی یہ ہی تو ہے۔لائن مینوں نے جھک کر تلقین شاہ کو فرشی سلام کیا اور کہنے لگے، شاہ جی معاف کرنا ہمیں پتہ نہ تھا۔چاہے واٹر ٹیکس ادا نہ ہو، پر شاہ جی کا نل نہیں کٹے گا، کبھی نہیں۔

ٹیکس والوں نے اشفاق کو دفتر میں حاضر ہونے کا حکم دیا۔ان کا مطالبہ تھا کہ ٹیکس کم ادا کیا گیا ہے۔ حساب کتاب پیش کیا جائے۔دفتر میں حاضر ہو کر اشفاق نے دیا گڑا۔ تلقین شاہ حاضر ہو گئے۔نتیجہ یہ ہوا کہ دکھانے اور نیا ٹیکس ادا کرنے کے بجائے ادا شدہ ٹیکس میں چھوٹ کے فارم بھر کر اشفاق گھر آ گیا۔

تلقین شاہ کی آمد نے اشفاق احمد کی زندگی کو سوتے جاگتے کا قصہ بنا دیا۔ اشفاق احمد، ابوالحسن تھا۔ الٰہی تھا۔ابوالحسن کو کوئی نہیں پوچھتا تھا۔ظل الٰہی کو دیکھ کر لوگ ادب، احترام اور محبت سے سر جھکا لیتے تھے۔

پہلے پہل اشفاق احمد کو بہت غصہ آتا تھا۔ بھٹیارن کی کڑاہی میں چڑ چڑ دانے بھنتے۔ وہ کہتا یارو! یہ گردی ہے۔ تلقین شاہ کو تخلیق کرنے والے کو کوئی نہیں پوچھتا۔ تلقین شاہ پیش کرنے والے آرٹسٹ پر لوگ جان ہیں۔ وہ تو شکر ہے تلقین شاہ کا پارٹ ادا کرنے والا آرٹسٹ خود اشفاق احمد تھا ورنہ کوئی اور ہوتا تو یا تو اشفاق احمد گلا گھونٹ دیتا اور یا آپ خودکشی کر لیتا۔

اپنی تخلیق میں وہ کسی دوسرے فرد کو کریڈٹ کا حصہ دار ماننے کے لیے تیار نہیں۔ وہ سمجھتا ہے کہ لکھنے والے کا حصہ ہے۔ آپ اس سے کہیں یار تمہارے فلاں ٹی وی کھیل میں فلاں شخص نے بہت عمدہ رول اسے ناگوار گزرے گی۔ فوراً جواب دے گا، ہاں یار اچھا خاصا کام کیا۔ بڑی ڈھونڈ کے بعد یہ ٹر کا تلاش کیا تھا آیا تو بالکل ہی کچا نکلا۔ اس پر بڑی محنت کرنی پڑی، خیر نبھا گیا۔

کریڈٹ بانٹنے میں اشفاق احمد ایک بنیا ہے۔ ایسا بنیا جو لیتے وقت دو اور دو پانچ گنتا ہے اور دیتے دو تین لیکن نہیں یہ مثال ٹھیک نہیں بیٹھتی چونکہ یہ بنیا دینے کا سرے سے قائل ہی نہیں۔

تلقین شاہ کی تخلیق میں اشفاق احمد کا کمال یہ ہے کہ اس نے کبھی اس پند و نصیحت کے جال بننے والے شیدائی پر پھبتی نہیں کسی۔ اسے من نہ کردم شما حذر بکنند کا طعنہ نہیں دیا۔ دوسروں کو کبڑا اپنانے کی سعی پیہم پر کبھی غصے کیا۔ الٹا وہ شاہ صاحب کی عظمت کو اجاگر کرتا رہتا ہے اور اس حد تک اجاگر کر دیتا ہے کہ شاہ صاحب کا باطن منظر عام پر آ جاتا ہے۔ یہی اشفاق احمد کے فن کا کمال ہے۔

تلقین شاہ میں اشفاق احمد نے اپنے بچپن کا کردار بھی پیش کیا ہے۔ جب وہ حقیقی شاہ صاحب کے ہدایت اللہ تھا۔

بنیادی طور پر اشفاق احمد آج بھی وہی ہدایت اللہ ہے۔ اگر وہ بظاہر ایسا نہیں دکھتا تو اس کی وجہ صرف شہرت کی وہ شہ نشین ہے جس پر وہ آلتی پالتی مارے داستان گو بن کر بیٹھا رہتا ہے۔

اشفاق احمد میں تحمل ہے، رواداری ہے، عجز ہے، مٹھاس ہے اور مدھم محبت کا بے پناہ "رنگ" ہے میں گرمائش کہا جا سکتا ہے۔ وہ ایک ایسا محبت کرنے والا غیر تلقین شاہی باپ ہے کہ اس کے تینوں بیٹے

بھی گئے ہیں۔ وہ ایک پیارا دوست ہے۔ بظاہر نرم لیکن بڑا سخت گیر افسر ہے۔ ایسا جی حضور یہ ماتحت ہے جو کام اپنی مرضی سے کرتا ہے لیکن اپنی مسلسل جی حضوری سے افسر کو اس خوش فہمی میں مبتلا رکھتا ہے کہ کام اس کی مرضی کے عین مطابق کیا جا رہا ہے۔

اشفاق احمد ایک آئیڈیل خاوند ہے۔ اس کے باوجود اگر بانو کو اس سے کوئی شکایت ہے تو یہ بانو کا اپنا قصور ہے جس کی تمام تر ذمہ داری خود بانو پر عائد ہوتی ہے۔ بانو کا قصور یہ ہے کہ وہ خالی بیوی ہی نہیں بلکہ ایک فنکار بھی ہے اور فنکار ہی نہیں بلکہ ایک بڑی فنکار ہے۔ داستان گو کسی بڑے فن کار کو لفٹ دینے کا عادی نہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اشفاق احمد نے آج تک ادبی ریڈیائی یا ٹی وی کے انٹرویوں کے علاوہ بانو کو بحیثیت فنکار کبھی تسلیم نہیں کیا۔ اگر آپ بانو کی تحریر کے متعلق اشفاق سے بات کریں تو یقیناً وہ کہے گا ہاں اچھا لکھتی ہے لیکن یار بڑی مغز ماری کے بعد اسے اس مقام پر لایا ہوں۔ پھر بھی اتنی ناشکر گزار ہے کہ میرے فقرے تک چرا لیتی ہے۔

اشفاق کی بیوی ہونے کی حیثیت سے بانو میں دو بڑے عیب ہیں۔ ایک تو وہ بڑی فنکار ہے اور دوسرے وہ محبت کرتی ہے اور اس کی محبت کا شیرا اتنا گاڑھا ہے کہ اشفاق ہر وقت یوں بیٹھا رہتا ہے جیسے کوئی بھینس راب کے چھپڑ میں پھنسی ہو۔

اشفاق کو اپنے رنگ میں دیکھنا ہو تو اس وقت دیکھیے جب وہ کچھا بنیان پہنے دھوپ میں بیٹھا کچھ کھا پی رہا ہو۔ اس وقت اسے احساس بھی نہیں ہوتا کہ لوگ اسے دیکھ رہے ہیں۔ دیکھ رہے ہیں تو پڑے دیکھیں۔ اس وقت کا نقشہ کھینچنا میرے بس کی بات نہیں۔ اس وقت یوں لگتا ہے جیسے مینڈک جوہڑ میں آ پہنچا ہو۔ اس وقت بانو بھی قابل دید ہوتی ہے۔ اس کی خوشی سمیٹے نہیں سمٹتی۔ یوں لگتا ہے کہ ایک طرف ڈالڈا ہی ڈالڈا ہوتا ہے اور دوسری طرف ممتا ہی ممتا۔

اشفاق احمد بلا کا خوش خور ہے۔ صرف اچھی چیز کھاتا ہے لیکن چیز اچھی ہو تو بہت کھاتا ہے اور اس اشتیاق سے کھاتا ہے کہ شبہ ہونے لگتا ہے کہ وہ پٹھان ہے۔

اشفاق احمد کو مشینوں سے محبت ہے۔ وہ انہیں ذی روح سمجھتا ہے اور مہاتما بدھ کی طرح ان کا احترام کرتا ہے۔ موٹر کو دیکھ کر وہ ہمیشہ احتجاجاً چیختا چلاتا ہے۔ ''ظالمو تم اس ننھی سی جان کا خیال نہیں رکھتے۔ تمہیں کیا پتہ کہ ایک چھوٹا انجن اپنی نازک سی جان کے بل بوتے پر لوہے کے اتنے بڑے کھڑ کھڑے کو دھکیل کر چلاتا ہے۔ اس ننھی جان کا کچھ تو خیال رکھا کرو۔'' اشفاق کے گھر میں طرح طرح کی مشینیں اور قسم قسم کے گیجٹ پڑے ہیں۔ چاہے اس کی جیب میں خرچے کے لیے نہ ہو۔ پھر بھی کباڑیے کی دکان پر نیا گیجٹ دیکھ کر وہ اسے خریدے بغیر نہیں رہ سکے گا۔ چاہے اس کے لیے اسے ہاتھ کی رہن رکھنی پڑے۔

گھر میں اشفاق احمد کی سب چیزیں کھلی پڑی رہتی ہیں جنہیں بچے آزادانہ استعمال کر سکتے ہیں۔ ماسوا اس کی مشینوں اور گیجٹوں کو ہاتھ لگانے کی کسی کو اجازت نہیں۔ فارغ وقت میں اشفاق احمد ان مشینوں کو باہر نکالتا ہے۔ بڑے پیار سے صاف کرتا ہے۔ تیل لگاتا ہے۔ گریس لگاتا ہے یعنی در پردہ اپنے ان کھلونوں سے کھیلتا ہے۔ کھیلنے کے بعد وہ مقفل کر

دی جاتی ہیں۔ آپ اشفاق سے اس کی موٹر مانگیں۔ وہ آپ کا شوفر بن جانا گوارا کرے گا لیکن اپنی موٹر آپ کو نہیں دے گا۔

آج بھی اتنی شہرت کا مالک ہونے کے باوجود اتنی جان پہچان کے باوجود اتنے میل ملاپ کے باوجود احمد اندر سے رابنسن کروسو ہے جو کئی ایک برس پہلے خان منزل کی بالائی نیم چھتی میں رہا کرتا ہے۔

اشفاق احمد اینٹی سوشل نہیں مگر وہ سوشل بھی نہیں۔ اس لیے کہ وہ لوگوں سے ملنے سے ہچکچاتا ہے۔ وہ بیٹھا وہ یوں نروان زدہ ہے جیسے دلدل کے کنارے دھوپ میں مگرمچھ پڑا ہو۔ اس وقت اگر ملازم آ کر کہے صاحب ملنے آئے ہیں تو پیشانی پر تلوار سی تیوری پڑ جاتی ہے۔ باہر ڈرائنگ روم میں جانا پڑ جائے تو اس کا چہرہ کہتا ہے ''مارے گئے۔'' یوں ظاہر ہوتا ہے کہ اگر ایک خون معاف ہو تو وہ فلاں صاحب کو جیتا نہ چھوڑے گا۔ ہے کہ ڈرائنگ روم میں پہنچ کر ایسے بڑے اخلاق سے ملے گا جیسے صبح سے انہی کے انتظار میں بیٹھا ہو اور پھر کے بعد ڈرائنگ روم سے ہنسنے کی آوازیں آنے لگتی ہیں۔ قہقہے گونجیں گے لیکن یقین جانیے یہ شور اور ہنگا پھڑکن کیسا کے مصداق ہوگا۔

اشفاق احمد کی سب سے بڑی عشرت یہ ہے کہ وہ کچھا اور بنیان میں اکیلا پڑا رہے۔ یوں پڑا رہے دلدل میں پڑا رہتا ہے۔ سوشل زندگی سے اجتناب کی وجہ سے وہ آج تک اپنا امیج نہیں بنا سکا۔ اس میں اہلیت نہیں مگر حسرت ضرور ہے۔ وہ مجھ سے اکثر کہا کرتا ہے مفتی جی بس میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ آئندہ زندگی بسر کروں گا اور اپنا امیج بناؤں گا۔ نہیں نہیں مذاق نہیں کر رہا۔ قدسیہ اور میں نے پکا ارادہ کر لیا ہے ایک روز شام کو سوشل وزٹ کیا کریں گے۔ آج ان کے ہاں کل ان کے ہاں اور پھر اس تمہید کے بعد ہم ڈریس باہر لان میں کرسیاں ڈال کر سوشل وزٹر کا انتظار کیا کریں گے۔ ہر مہینے چار ایک دعوتیں دیا کریں گے۔ کبھی میں۔ میں آج کل سوشل آداب پر ایک کتاب پڑھ رہا ہوں۔ قدسیہ انٹرنیشنل کھانے پکانا سیکھ رہی ہے۔

ایک بار اشفاق نے اپنے اس سوشل پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش بھی کی تھی۔ تین دن اشفاق شام کے وقت سوشل وزٹ کرتے، پھر پتہ نہیں کیا ہوا چوتھے روز وہ اپنے صحن میں حسب دستور مگرمچھ تھا اور سامنے بانو ممتا کے ڈھیر لگائے بیٹھی تھی۔

میں نے سوچا وہ تمہارا سوشل پروگرام کیا ہوا۔ کہنے لگے جو سکھ چھجو کے چوبارے میں ہے، نہ بلخ میں ہے۔

سوشل اور ادبی امیج پیدا نہ کرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اشفاق احمد ازلی طور پر ایک کامی ہے۔ کامی جسے مزدوری کرنے کی لت پڑی ہوئی ہے۔ چاہے ضرورت ہو یا نہ ہو وہ مزدوری کرنے کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ امیج بنانا ایک الگ فن ہے جسے فنون لطیفہ سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ ایک جدید فن ہے جو حال ہی میں ایجاد کیا گیا ہے خاصا رائج ہوتا جا رہا ہے۔ اس فن کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ آپ کام کریں یا نہ کریں۔ نہ کریں تو بہتر ہے فنکار کہلائیں گے۔ چاروں طرف آپ کے نام کا ڈنکا بجے۔ جس جگہ بیٹھیں وہ نشستِ صدر بن جائے۔

اشفاق اور بانو کے اس طبعی غیر سوشل رجحان کا نتیجہ یہ ہے کہ اتنا کام کرنے کے باوجود کسی سرکاری یا نیم سرکاری پروگرام یا مجوزہ تحریک یا تنظیم میں کبھی ان کا نام نظر نہیں آئے گا۔ چونکہ ان کا کوئی امیج نہیں، نہ ان میں امیج بنانے کی ہمت کی ہے۔

اشفاق احمد کا گھر میری زندگی میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ مجھے اشفاق کے گھر سے محبت ہے۔ مجھے اس دکھی سے مگر مجھ سے محبت ہے جو اس خوب صورت وسیع و عریض مکان میں یوں پڑا رہتا ہے جیسے وہ مشرقی پاکستان کا ایک طوفان زدہ علاقہ ہو۔ مجھے اس فراق زدے سے محبت ہے جسے دنیا میں اشفاق کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ جو ہر وقت یا تو مگر مچھ بچے چھپاتے تازہ کوٹ چڑھاتی رہتی ہے یا ممتا کے ڈھیر لگانے میں کھوئی رہتی ہے۔ مجھے ان تین جنوں سے محبت ہے جو کھجور کے سائے تلے پرورش پانے کی لذت سے محروم ہیں۔ اشفاق احمد کے گھر کے مجھ پر بڑے احسانات ہیں۔ گذشتہ کئی سالوں سے اشفاق کا گھر میری واحد پناہ گاہ ہے جیسے بھنگ پینے والے کے لیے فقیر کا تکیہ ہوتا ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ چاروں طرف اشفاق ہی اشفاق ہوتا ہے۔ داستان گو کو گھر میں داخل ہونے کی اجازت نہیں۔ اگرچہ داستان گو نے اشفاق کے نئے گھر پر داستان سرائے کی تختی لگا رکھی ہے لیکن داستان گو ڈرائنگ روم سے ورے نہیں آ سکتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اشفاق کے گھر کا نام داستان سرائے نہیں بلکہ منشی خانہ ہونا چاہیے کیونکہ یہ گھر دو منشیوں کی کامیاب جدوجہد کا نتیجہ ہے۔ یہ گھر قرض پر بنا ہے اور اس قرض کو صرف سکرپٹوں کی مدد سے اتارا جا سکتا ہے اور اسے ادا کرنے کے لیے دونوں منشی دن رات قلم کا پھاوڑا چلانے میں مصروف رہتے ہیں۔

میں داستان گو کی قابلیت کا اعتراف کرتا ہوں۔ میں اس کی تخلیقی قوتوں کو مانتا ہوں۔ میں اس کے سنہرے پھول بوٹوں کی سجاوٹ کو پسند کرتا ہوں۔ میں اس کے مجمع لگانے کی عادت کو زیادہ ناپسند نہیں کرتا لیکن میں ایک دانشور ہوں۔ میں یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ وہ میرے سامنے کھڑا ہو کر مونچھ مروڑے۔

عبدالرحمٰن چغتائی

عبدالرحمٰن چغتائی سے تعارف ہمیں بابے بیز کی زبانی ہوا۔ وہ عموماً ان کا ذکر کرتا۔ ہم یہ سمجھتے تھے کہ وہ ہر مغربی آدمی کی طرح نئے کلچر، موسم اور شہر میں گھومتا پھرتا تحیر کا شکار ہے۔

ایک دن اس کی اصرار بھری گفتگو کے دوران خاں صاحب نے پوچھا۔

''بھئی چغتائی...... چغتائی۔ وہ ہے کون؟''

''اشفاق صاحب...... جس کشمیری بابے کے پاس میں جاتا ہوں، ان کے پڑوس میں ہی عبدالرحمٰن چغتائی رہتے ہیں۔ اوپر سٹوڈیو ہے، ہر طرف پین ڈرائنگز بکھری ہوئی ہیں۔ اس کے گھوڑے اور عورت کے ٹمبل نے تو مجھے حیران کر دیا ہے۔ آپ کبھی موہنی روڈ نہیں گئے ان کا سٹوڈیو دیکھنے؟''

''تو کیا وہ رنگوں کا استعمال نہیں کرتا؟''

"کرتا ہے کرتا ہے...... لیکن پھر رنگ بھی خود ہی بناتا ہے۔ بنے بنائے رنگ اسے پسند نہیں آتے۔"

"کمال ہے۔"

"کیا آپ میوزیم نہیں گئے۔ وہاں تو آپ نے ان کا کام دیکھا ہی ہوگا؟"

اب اسے کون بتائے، اپنے وطن میں کون میوزیم دیکھتا ہے۔ کس کو فکر ہوتی ہے کہ قومی ورثے کی حفاظت کرے۔ کس آدمی کے پاس اتنی فرصت ہوتی ہے کہ وہ پرانی عمارتوں کے قصے ہسٹری، اہمیت جتا کر بچوں کو قومی ا... احساس دلائے۔ یہ سارے کام زندہ قومیں کرتی ہیں، جن کے لیے روزی کمانا ہمہ وقت مصروفیت نہیں، جو اپنے مستقبل سے غافل نہیں ہوتے۔

بہر کیف میں نے تو پروانہ کی لیکن خاں صاحب پتہ نہیں چغتائی صاحب کے سٹوڈیو میں کتنی بار گئے اور کس... متاثر ہو کر آئے۔ ایک روز میں باورچی خانے میں رعب ڈالنے میں مصروف تھی کہ مجھے آ کر کہنے لگے۔

"جیونی یہ سب سنبھال لے گی۔ تم میرے ساتھ آؤ۔"

سارے راستے انہوں نے مجھے ایک بار بھی نہ بتایا کہ ہم کہاں جا رہے ہیں اور کیوں جا رہے ہیں۔

دوسری منزل پر چغتائی صاحب کا سٹوڈیو تمام تخلیق کاروں کی طرح بے ترتیب تھا لیکن جسے میں بے ترتیب... رہی تھی اسی میں چغتائی صاحب کی ترتیب پوشیدہ تھی۔ مجھے دیکھ کر انہوں نے بڑی خوشی کا اظہار کیا۔ ابھی چند تصویریں دیکھ پائے تھے کہ بڑی خوشبودار گلابی گلابی کشمیری چائے آ گئی۔

چند تصویریں چغتائی صاحب نے علیحدہ رکھ لیں۔ جب ہم رخصت ہونے لگے تو وہ تصاویر مجھے دیتے... چغتائی صاحب بولے۔

"بھابھی صاحب! یہ آپ کے لیے ہیں۔ میرا ناچیز حقیر تحفہ قبول کیجیے۔"

میں ہکا بکا تصویریں اٹھانے لگی تو "ناں ناں" کر کے انہوں نے روک دیا اور چھوٹے سے کہا کہ وہ ... کار میں تصویریں رکھ دے۔ اس کے بعد میں تو تصویروں سمیت چغتائی صاحب کو بھول گئی لیکن انہوں نے مجھے بڑے محبت بھرے خط "بھابھی صاحب" کے القاب سے شروع کر کے لکھے۔

یہ میں اس لیے بیان کر رہی ہوں کہ عبدالرحمن چغتائی کے ساتھ اس تعلق سے فائدہ اٹھاؤں اور اتنے بڑے کریڈٹ کارڈ آپ کو دکھا کر آپ سے عزت کی پونجی وصول کروں۔

چغتائی صاحب کے جانے کے بعد یکدم کہیں سے عبدالرحیم چغتائی منظر پر آ دھمکے۔ انہوں نے ایک... ملاقات تو خاں صاحب سے تکلفاً کی، پھر تصویروں کے لیے اصرار شروع کر دیا۔

"اگر آپ کے پاس ان کے کچھ ذاتی خط ہوں تو وہ بھی دے دیجیے۔ میوزیم میں ان کی ضرورت ہوگی۔"

دو تین تصویریں شاید ہمارے پاس کہیں ادھر اُدھر پڑی رہ گئیں لیکن زیادہ تصویریں اور خط چغتائی کے بیٹے ملکیت سمجھ کر واپس لے گئے۔ شاید ہر بڑے آدمی کے بعد یوں ہی اُس کی ذات کو سمیٹا جاتا ہے۔

انشاجی

خاں صاحب نے اپنے مضمون ''رینی ڈے'' میں لکھا ہے کہ شہاب بھائی کی ایک گپت پائپ لائن ایسی تھی جس لوگوں کی خفیہ مدد کر کے اپنی عاقبت سنوارا کرتے تھے۔ وہ کسی بڑھی مائی کی طرح اپنی جیب کی پوٹلیاں چوری کرتے اور کسی پر اپنا راز افشانہ کرتے۔

ہم جب سمن آباد میں تھے اور ''داستان گو'' ایک مہنگی عیاشی تھی، انہوں نے خاں صاحب کو ساتھ لیا اور کراچی ...روں کے لیے روانہ ہوئے۔ انہوں نے اپنے سیکرٹری ہونے کا فائدہ اٹھانا چاہا۔ ایک لمحے کے لیے بھی یہ نہ سوچا کہ ...رح اشتہار مانگتے پھرنا ان کی شہرت کو بٹہ لگا سکتا ہے۔ جب اشتہار ملنے میں ناکامی ہوئی تو شہاب صاحب نے خاں ...کے لیے نوکری کا بندوبست کیا اور انہیں اردو سائنس بورڈ میں ڈائریکٹر بنادیا۔

شہاب صاحب کی دوسری نیکی جو ہمارے دیکھنے میں آئی، وہ انشاجی کو نوکری میں ایڈجسٹ کرنے میں مشغول تھے۔ یہی انشاجی تھے جنہوں نے ہمارے لیے بڑا خوبصورت یہ مصرعہ چھوڑا

''انشاجی اب کوچ کرو اس شہر میں جی کو لگانا کیا''

اس مصرعے سے آپ یہ نہ سمجھئیں کہ انشاجی کہیں اداسی، ناامیدی یا فکرمندی کا شکار تھے۔ میں نے انہیں جب ...دیکھا ان کے چہرے پر بشاشت ہی دیکھی۔ شہاب صاحب کے کاسنی کمرے میں مہمان ٹھہرنے سے کتراتے تھے لیکن ...جی نے کبھی اس کمرے میں ٹھہرتے ہوئے ہچکچاہٹ محسوس نہ کی۔ وہ جب بھی آتے کمرے سے باورچی خانے تک چکر ...میں لگاتے رہتے۔

''کیا پکایا ہے بانو؟''

''جی سرسوں کا ساگ، مکی کی روٹی اور تازہ مکھن۔''

دوسرے چکر تک انہیں Menu بھول جاتا اور وہ پھر پوچھتے۔ اگلے دن پھر وہی سوال۔

''اور آج۔''

''آج تو گاجر آلو کی بھجیا ہے۔''

''بہت اچھے.....'' وہ انفرمیشن لے کر لوٹ جاتے۔

انہوں نے کبھی کسی کھانے کی ازخود فرمائش نہ کی۔

ہم عہد رفتہ کے لوگ ہیں۔ ہماری طرزِ معاشرت، اقدار اور ذاتی تجربات سے اخذ کی ہوئی دانش آج کے دور ...لاگو نہیں ہوتی لیکن آج کی نوجوان نسل دور دراز کے بھولے بھٹکے معاشروں کا مطالعہ انٹرنیٹ پر کرنے کی عادی ہے۔ ...ریقہ کے جنگلوں میں بسنے والوں کی بودوباش، میکسیکو، کیوبا اور Inca کے رسم ورواج پر معلومات حاصل کرنا ان کی ہابی ہے۔ اسی تجسس پر تکیہ کر کے اس نئی پود سے مخاطب ہونے کی جسارت کر رہی ہوں۔

لمبے تجربے سے میں نے یہ بات اخذ کی ہے کہ جس شخص نے مثبت شیشوں کی عینک اپنے چہرے پر سجائی اس کا :

رویہ، سوچ اور عمل مثبت ہو جاتے ہیں۔ وہ چاہے بیاباں سے گزرے، چاہے خارزار سے، ناداری، مفلسی یا تنگ رہے یا بے وفائی اور بے توجہی کے تھپیڑے کھائے۔ اس کے چہرے پر بشاشت اور دل میں طمانیت رہتی ہے۔

جس شخص کے چہرے پر منفی شیشوں کی دھندلی عینک چڑھی رہے اس کا رویہ، سوچ اور عمل ہمیشہ منفی رہتے ہیں۔ بھلے ہی محلوں میں رہے، کوٹھیوں کے مالک ہو، لمبی کاروں سے اترنے بیٹھنے والا ہو۔ اسے بے اطمینانی، مایوسی اور ... نہیں چھوڑتے۔

شہاب صاحب اور ان کے قریبی دوستوں میں ابنِ انشا واحد ایسے شخص تھے جن کے چہرے پر سے ... نہیں اتری۔ یہ نہیں کہ ان کی زندگی آسان تھی لیکن ان کے مثبت رویے، سوچ اور فکر نے انہیں کبھی ناامیدی کے ... کیا۔ ہمیشہ شانت، مسرور اور پرامن نظر آئے۔

یہ اسلام آباد کا واقعہ ہے۔

شہاب صاحب اپنی بہن محمودہ اور ان کے میاں امین بھائی کے گھر میں رہتے تھے۔ عفت کے جانے ... ثاقب کی تنہائی کا خیال کرتے ہوئے انہوں نے یہیں بسرام کر لیا تھا، تاکہ ثاقب تنہائی کا شکار نہ ہو اور بھرے گھر میں بڑھے۔

شہاب صاحب، مفتی جی، اشفاق صاحب ڈرائنگ روم میں جمع تھے۔ ابنِ انشا کرسی کھینچ کر ٹیلی ویژن کے ... بیٹھے تھے۔ میں اور محمودہ جی اضافی Also Rau قسم کے تماشائی سب خاں صاحب کا ڈرامہ چانگڑہ دیکھ رہے تھے۔ انشا کچھ پریشان تھے۔ محمودہ جی بار بار دوپٹے سے منہ پونچھ رہی تھیں۔ جب ڈرامہ آخری چند سینوں پر پہنچا تو انشا جی اٹھ کھڑے ہوئے اور گھبرا کر بولے۔ ''یہ اشفاق بہت ظالم آدمی ہے۔ اس نے بچہ مار دینا ہے۔ میں چلا ... میں جب ڈرامہ ختم ہو جائے گا تو آ جاؤں گا۔''

محمودہ جی بولیں۔ ''بخار اتر گیا۔ آئیں انشا جی لال لوبیا کھائیں۔ آپ کا پسندیدہ کھانا۔''

انشا جی نے سکھ کا سانس لیا اور خاں صاحب کا شکریہ ادا کیا۔

ایک مرتبہ ہم کراچی گئے۔ ہم انشا جی کے دفتر میں ان سے ملنے گئے۔ وہ گھومنے والی کرسی پر بیٹھے ... والی سیدھی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ کراچی کے متعلق سرسری گپ شپ ہونے لگی۔ کچھ دیر بعد خاں صاحب نے کہا۔ ''انشا جی! دو سو روپے دے دو ... درکار ہیں۔''

مجھے کبھی علم نہ ہوتا کہ خاں صاحب کے بٹوے میں کتنے پیسے ہیں۔ اس لیے مجھے تھوڑا سا تعجب ہوا کہ گھر سے پہلے انہوں نے خاطر خواہ انتظام کیوں نہ کیا؟ انشا جی نے خاں صاحب کی بات کا رتی بھر نوٹس نہ لیا اور ... لے کر منگھو پیر تک ہر رنگ کی بات جاری رہی۔ مجھے ان کی بے پروائی پر ذرا سا ملال ہوا۔ پھر اچانک انہوں نے رازداری سے اپنا دراز کھولا۔ کچھ ہلکا سا تلاش کیا اور بڑی ہی رازداری سے ایک لفافہ خاں صاحب کو پکڑا دیا۔

اس لفافے پر لکھا تھا ''More?''

انشا جی کا یہی طریقہ تھا، وہ مانگنے والے کو رازداری سے عطا کرتے، اسے مانگنے کی خجالت سے بچاتے ...

پیسہ جو مانگا جاتا اس سے سوا دیتے۔ وہ جانتے تھے کہ مانگنے والا عموماً ضرورت سے کم مانگتا ہے۔ ایک مرتبہ انشاء جی ہمارے گھر پر مقیم تھے کہ ایک سائلہ آئی۔ اس نے ہزار روپے مانگے۔ انشاء جی نے اسے دو ہزار پکڑا دیئے۔ خاں صاحب بولے۔ "یار انشا! اس نے ہزار مانگا تھا تم نے دو ہزار کیوں دیئے؟"

کہنے لگے "خود ہی تو کہا کرتا ہے کہ دھرم پورے والے بابا سائیں فضل شاہ کا فرمان ہے دل کھول کر دو..... تم نے وِتّے میں سے ہی دینا ہے، کون سا پلّے سے جاتا ہے۔"

میں بھی "وِتّے میں سے دینے" کا فلسفہ سنتی رہی تھی لیکن انشاء جی کی طرح عمل تک نہ پہنچ پائی تھی۔

آخری مرتبہ جب وہ ہمارے پاس لندن جانے سے پہلے آئے تو ان کا چہرہ سبزی مائل زرد تھا۔ وہ بڑی تکلیف میں تھے لیکن ہمیشہ کی طرح چہرے پر طمانیت اور سکون تھا۔

ویسے تو شہاب صاحب، مفتی جی اور خاں صاحب کی عینکوں کے شیشے بھی مثبت تھے لیکن کبھی کبھی وہ یہ عینکیں اتار کر مابعد اور نامعلوم کی تلاش میں چل نکلتے تھے۔ انشاء جی کو کبھی تلاش نے تنگ نہیں کیا..... کیونکہ انہوں نے کبھی اپنی مثبت عینکوں کی عینک اتاری ہی نہیں۔ کبھی اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہوئے۔ پھر وہ اور کیا تلاش کرتے؟

ان کا زرد رنگ اور پیلے ہاتھ دیکھ کر میں نے خاں صاحب سے پوچھا۔

"انشاء جی کو کیا ہوا ہے؟"

"کیا ہوا۔ یہ انشا کو؟"

"دیکھتے نہیں ان کا رنگ ہلدی سا ہے۔ بیمار ہیں کیا؟"

مجھے اب معلوم ہوا کہ انشاء جی کینسر کے مریض تھے۔ غالباً خاں صاحب کو اس وقت صحیح حالت معلوم تھی لیکن خاں صاحب کی ستر پوشی کے مختلف اصول تھے۔ وہ کسی شخص کی ناداری، بیماری، ذلت اور بیکاری کو اپنے تک محدود رکھتے۔ ان کا ہمیشہ یہ خیال تھا کہ لوگ ایسے حالات جان کر محض گفتگو کا موضوع بنا دیتے ہیں اور اسے غیبت کی ایک گھناؤنی شکل عطا کر دیتے ہیں۔ اس لیے ایسی انفرمیشن کو افواہ کی شکل نہیں دینی چاہیے بلکہ اوپر والے ستر پوش کی طرح چشم پوشی کرنے میں ہی بہتری ہے۔

شہاب بھائی نے انشاء جی کے لیے لندن میں نوکری کا بندوبست کر دیا تھا۔ وہاں وہ ایک بڑے میوزیم (انڈیا آفس لائبریری) کے کرتا دھرتا تھے۔ اس میوزیم میں پاکستان کی نادر کتابیں، اہم ادیبوں کا کام اور سیاسی لیڈروں اور عام ملکر ہمارے کلچرل Heritage کا خزانہ جمع تھا۔ انشاء جی اپنی مثبت عینکیں لگائے اپنے کام میں مگن تھے۔

آخری بار ہم انشاء جی کے پاس لندن پہنچے۔

انہوں نے ہمیں لائبریری میں مدعو کیا۔ کچھ انگریزی اور پاکستانی سکالر وہاں جمع تھے۔ خاں صاحب نے ہمیشہ کی طرح اپنے مسلک کے عین مطابق دو قومی نظریہ پر تقریر کی اور پاکستانی کلچر کا تشخص بھارت کے رسم و رواج سے مختلف سمت میں دکھا کر پیش کیا۔ انشاء جی بہت خوش ہوئے اور بعد میں بولے۔ "یار تو ادیب کی ذمہ داری سمجھتا ہے۔ یہ نیا ملک ہے۔ اس کی Ideology کو سمجھانے کی ضرورت ہے۔ کاش! ہم سب شاعری میں علامہ اقبال کا پرچم اٹھا کر چلیں۔"

''ہاں وہ تو ہے لیکن سب ادیبوں میں وہ اچ اور Genius نہیں ہے۔''

انشا جی نے پُر امید لہجے میں کہا۔ ''یار تو ذہین آدمی ہے۔ کچھ اس سلسلے میں ہمت کرناں۔ کوئی تحریک اُٹھے کوئی سنگت تشکیل دے ناں۔ یہ تنکے تنکے بکھرا جھاڑو اکٹھا کرناں۔''

''کروں تو..... لیکن وہ سمجھیں گے اشفاق چودھراہٹ چاہتا ہے۔ لیڈری کا شوق ہے اسے۔ میری برادری تو میری نہیں مانے گی کبھی بھی۔''

''لے لے ناں یہ الزام، پھر کیا ہوا۔ جب تیری نیت صاف ہے تو پھر الزام کی فکر کیسی؟''

''بھائی انشا جی! ادیبوں کا بڑا مسئلہ اُن کی انا ہے۔ ان کی کمر میں لوہے کی لٹھ پڑی ہے۔ وہ کب جھکا ہے کسی کے آگے؟''

جب انشا جی باتیں کر رہے تھے تو میں نے نوٹس لیا کہ اُن کے ہاتھ، خاص کر اندر کی ہتھیلی انڈے کی زردی کی طرح پیلی تھی۔ پھر انہوں نے آنکھیں اِدھر اُدھر گھمائیں تو آنکھوں کی سفیدی حیرت انگیز حد تک بے رنگ نظر آئی۔ میں پہنچ کر میں نے خاں صاحب سے ایک بار پھر اپنی تشویش کا ذکر کیا۔

''انشا جی کی طبیعت تو مجھے ٹھیک نہیں لگتی خاں صاحب۔''

''تمہیں تو ہر وقت ایسے ہی وہم ہو جاتے ہیں۔ ٹٹو جیسا دندناتا پھرتا ہے۔ واہ کیا کام ہے کیا خزانہ کتابوں کا کر لیا۔ پتہ نہیں ہم اس خزانے سے کچھ اٹھا سکیں گے یا نہیں لیکن یہاں کے سکالر اس کا مطالعہ کر کے کوئی بڑی بات پاکستان پر کریں گے۔''

''لیکن جی ان کی صحت۔''

''تم پیلے ہاتھوں کا مرثیہ گا رہی ہو۔ یہ میرے ہاتھ دیکھو۔''

خاں صاحب کے سفید رنگ کی وجہ سے ان کے ہاتھ پیلے مسطر کی طرح پیلے ہو رہے تھے۔

میں نے ابھی تک ان کے ہاتھوں کی طرف کبھی توجہ نہ دی تھی۔ میرا خیال تھا کہ کام کی زیادتی اور آرام کے باعث وہ یوں زردی مائل ہوتے جا رہے ہیں۔ میری بے فکری کا اندازہ اس بات سے لگائیے کہ میں نے انشا جی کی بیماری تو بھانپ لی لیکن مجھے لحظہ بھر کے لیے شبہ نہ ہوا کہ خاں صاحب بھی کینسر کے موذی مرض میں مبتلا ہو گئے ہیں۔

کچھ ہی دیر گزری تھی کہ انشا جی کراچی لوٹ آئے۔ ڈاکٹروں نے ان کا اصلی مرض تشخیص کر لیا تھا۔ انشا جی تو ہمارے پاس نہ آئے لیکن ان کا رابطہ اور بھی باقاعدہ ہو گیا۔ انہیں فکر تھی کہ ان کی کتابوں کی اشاعت ان کے بعد کون کرے گا۔ وہ کسی پبلشر سے معاہدہ نہیں کرنا چاہتے تھے۔ پھر گھر کا بھی مسئلہ تھا۔

ان مسائل کو سلجھانے میں خاں صاحب ان کے ساتھ ساتھ رہے لیکن وہ زیادہ فکریں ساتھ ہی لے گئے۔ ایک شریف النفس، شرمیلا اور غیرت مند ادیب کا انجام آ پہنچا۔ اوپر والا کیوں چاہتا ہے، کب چاہتا ہے اور کیسے چاہتا ہے اس کا بھید کبھی کسی انسان کو کُلی طور پر نہیں ہو سکا۔ انسان کا علم ہمیشہ سے قلیل ہی رہا ہے اور رہے گا۔ جتنا برتن اتنا ہی برتن میں موسلا دھار بارش ساری تو سما نہیں سکتی البتہ مقدور بھر پانی ضرور اکٹھا کیا جا سکتا ہے۔

انشا جی کے کوچ کرنے کے بعد سمجھ آئی۔

''انشا جی چلو اب کوچ کرو اس شہر میں جی کو لگانا کیا''

ہو سکتا ہے ان کا دل کبھی بھی اطمینان یا خوشی سے ہمکنار نہ رہا ہو لیکن ان کی مثبت عینکوں نے ان کے چہرے پر بھی بے اطمینانی کا منظر پیش نہیں کیا۔

انتظار حسین

یہ A.R.Y. فنکشن کا ذکر ہے۔ مجھے اس فنکشن پر دس لاکھ کا انعام ملا تھا اور اسی قدر رقم انتظار حسین صاحب کو ملی تھی۔ ہم ایک ہی ہوٹل میں رہ رہے تھے۔ ایک روز میں اور خاں صاحب باہر نکلے تو انتظار صاحب بھی باہر ہی آ رہے تھے۔ میں نے ہمیشہ کی طرح بلا سوچے سمجھے عالیہ کا ہاتھ پکڑ لیا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ وہ اس درجے بیمار ہے۔ جب ہم باہر نکلے تو انتظار بھائی نے مجھے کہا ''شکریہ ایوں پبلک میں اس کا ہاتھ پکڑ کر باہر لانا مجھے کچھ معیوب سا لگا لیکن آپ کی بہت مہربانی کی جو عالیہ کو سنبھال لیا۔''

انہوں نے میرے کردار کی تعریف ضرور کی لیکن میری تسلی نہ ہوئی کیونکہ انہوں نے میرے ادبی کام کے متعلق ایک لفظ نہ کہا۔ جب عالیہ دنیا سے رخصت ہوئی تو بڑی مروت سے ہمیں اس کے متعلق اطلاع دینے خود تشریف لائے۔

''کل قبرستان میں ہی اس کے قل ہیں۔ چند لوگوں کو اطلاع دی ہے، آپ دونوں ضرور آیئے۔'' ہم دونوں قبرستان پہنچے۔ چند لوگ موجود تھے۔ تازہ قبر پر تھوڑے سے پھول چڑھائے۔ ایک اچھی روح کو رخصت کیا اور سوچتے رہے کہ انتظار بھائی بھی کتنے بڑے آدمی ہیں۔ ان کے گھر میں اللہ نے بچے کا چراغ نہ جلایا لیکن وہ نہ اللہ کے شاکی ہوئے نہ بیوی کو بچے کی خاطر چھوڑ کر دوسری شادی کے مرتکب ہوئے۔

انتظار حسین، خاں صاحب کے داؤ جی کو ان کے ادب کی معراج سمجھتے تھے۔ اس کے بعد کا جو ادب خاں صاحب نے پیش کیا، اس کے وہ قائل نہ تھے۔ میں انتظار حسین کو ایک بڑا لکھاری سمجھتی ہوں۔ مشکل یہ ہے کہ میرا ان کا مسلک ایک نہیں۔ میرا خیال ہے کہ انتظار حسین پاکستان کی نعمت ملنے کے بعد بھی ابھی Nostalgia کی کہانیاں لکھ رہے ہیں۔ جو لوگ پیچھے مڑ کر دیکھتے ہیں پتھر کے بن جاتے ہیں اور اللہ کی رحمت سے منکر ہونے کے مرتکب ہوتے ہیں۔

یہ نہ سمجھیے میں انتظار حسین کی تخلیقی ہنر مندی، ان کی زبان و بیان کی ثنا خواں نہیں۔ مشکل صرف اتنی ہے کہ میں تنگ نظر ہوں۔ مجھ میں واقعی وسعت قلب کی کمی ہے جو انسان کو لبرل ہونا سکھاتی ہے۔

انتظار بھائی اب بھی میری دلجوئی کے لیے آتے رہتے ہیں۔ خاموشی سے میرے زخم پر پھاہا رکھتے ہیں۔ ڈیرہ گھڑی یہاں سے تھوڑا سا کھا پی لیتے ہیں لیکن آج تک ہم دونوں میں تخلیقی عمل پر کوئی بات چیت نہیں ہوئی۔